عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی !!

ادارہ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ غزالی

جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ / ستمبر ۲۰۰۲ء

ناشر: **ادارہ اشرفیہ عزیزیہ پشاور**

فہرست

سالانہ بدل اشتراک: ۱۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ: مکان p-12 یونیورسٹی کیمپس پشاور۔

کمرہ نمبر 106، رازی ہال۔K.M.C پشاور۔

ڈاکٹر فدا محمد

ابتدائیہ

بندہ کے شیخ و مربی جناب حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحبؒ نے ایک رسالہ البیان کے نام سے شروع فرمایا، جو تھوڑے عرصے میں پاکستان و ہندوستان کے رسالوں میں صفِ اوّل کا دینی و ادبی رسالہ شمار ہونے لگا۔لیکن حضرت کی علالت اور ساتھیوں کی مالی و عملی عدم دلچسپی کی وجہ سے بند ہوگیا۔ بندہ کے دل میں یہ بات بار بار وارد ہوتی رہی کہ ایک دینی، علمی و ادبی ماہنامہ شروع کیا جائے۔لیکن بندہ کی علمی کم مائیگی نیز شخصی لحاظ سے بے حیثیت ہونا اس کے لئے سدراہ رہے۔ایک خیال یہ بھی رہا کہ بہت سے مُفید اور بلند پایہ رسائل معاشرہ میں موجود ہیں۔خیر آیت "وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْن" (اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو)۔سے ہمّت بندھی۔جس کے تقاضے کے تحت نصیحت کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے، کہ نصیحت مؤمنین کو فائدہ دیتی ہے۔نصیحت جہاں زبانی طور پر بول کر ہے، وہاں تحریری طور پر لکھ کر بھی ہے۔چنانچہ تحریر کو اشاعت دین کے شعبوں میں سے ایک اہم شعبے کے طور پر خود قرآن نے متعارف کروایا، قلم کی قسم کھائی اور جو تحریر قلم سے وجود میں آتی ہے اس کی قسم اٹھا کر تحریر کی اہمیّت کو واضح کیا۔

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے تحریر کو اہم شعبے کے طور پر استعمال فرمایا۔ شروع سے ہی وحی کے لکھنے کا بندوبست فرمایا۔آپ کی احادیث آپ کے سامنے لکھی گئیں۔کچھ باتیں آپؐ نے خود املاء کر کے لکھوائیں۔سلاطین اور بادشاہوں کو دینی

دعوت بطورِ تحریر خطوط کی شکل میں بھیجی گئی۔ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے، اُنھیں اس شرط پر آزاد فرمایا کہ ہر آدمی بیس افراد کو لکھنا سِکھا دے، یہی اس کا فدیہ ہوگا۔

رسائل کی شکل میں بار بار مختلف مضامین کو بطور یاد دہانی سامنے لاکر عمل کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہر سلسلہ اور تنظیم کے افراد کی باہمی مناسبت اور یگانگت ہوتی ہے۔ اپنے سلسلہ کی چیز سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اس کی اشاعت کے لئے زیادہ فکرمند ہوتے ہیں نیز ماہنامہ سلسلہ کے افراد کے باہمی ربط کو زیادہ کرنے اور سلسلے کی اطلاعات پہنچنے کا مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے فائدے سے خالی کسی صورت نہیں ہوتا۔ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسالہ ''الغزالی'' کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ رسالے کی ترتیب اس رُخ سے ہوگی، ایک باب تلقینِ غزالیؒ، ایک فیضِ سرہندیؒ (مجدّد الف ثانیؒ)، ایک فکرِ ولی اللّٰہی (حضرت شاہ ولی اللہ)، ایک مطبِ تھانویؒ (حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)، ایک خوانِ ندوی (علّامہ سیّد سُلیمان ندویؒ، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ) اور ایک بزمِ اشرف (بندہ کے شیخ حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ) ہو۔ اس کے علاوہ ایک باب ''قارئین کی نفسیاتی و معاشرتی اُلجھنیں اور اُن کا حل''، بدنی و جسمانی بیماریاں اور ان کے بارے میں مشورہ نیز روز مرّہ کے فقہی مسائل اور اُن کا جواب۔ اہلِ علم سے درخواست کی گئی ہے کہ ہماری کوششوں پر نظر رکھیں تاکہ کوتاہیوں کی بروقت نشاندہی ہوتی رہے۔ اگر دربارِ خداوندی میں شرفِ قبولیّت حاصل ہو تو زہے نصیب۔

ڈاکٹر فدا محمد

رسالہ کے عملہ کا تعارف

سرپرست: حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر میاں سعیداللہ جان صاحب ۔شبقدر کے علاقہ ماہزارہ کے رہنے والے ہیں ۔حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ کے پُرانے رفقاء میں سے ہیں۔آپ درسِ نظامی کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔پشاور یونیورسٹی سے نُمایاں حیثّیت کے ساتھ ایم ۔اے اسلامیات کیا ہے اور سندھ یونیورسٹی سے اسلامیات میں پی ۔ایچ ۔ڈی (Ph-D) کی ہے۔شعبۂ اسلامیات پشاور یونیورسٹی کے استاد، صدرِ شعبہ اور بطورِ ڈین فیکلٹی ،مختلف حیثیتوں سے فرائض انجام دے کر ریٹائر ہوئے ہیں۔آپ سلسلہ تصوُّف کی قادریّہ شاخ میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت تھے۔اُن کی وفات کے بعد قاضی زاہد الحسینی صاحبؒ سے مُنسلک ہوئے اور قاضی صاحب سے ہی قادریّہ سلسلہ میں خلافت ملی ہے۔اشاعتِ دین اور اعلائے کلمۃُ اللہ کا جذبہ رکھنے والے ہیں۔

بانی: رسالہ کے بانی ڈاکٹر فدا محمد صاحب،خیبر میڈیکل کالج پشاور کے شعبہ اناٹومی کے پروفیسر و سربراہ ہیں اور حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانیؒ کے خلیفہ ہیں۔

ایڈیٹر: رسالہ کے ایڈیٹر ثاقب علی خان صاحب طاہر خیلی انجنیئر ہیں۔دینی ذوق و شوق والے اور فہم و فراست والے نوجوان ہیں۔سلسلہ کے اشاعتی کاموں میں انتھک محنت کرتے ہیں۔

مجلسِ مُشاورت:

۱) مولانا محمد امین دوست صاحب: مولانا صاحب مدرسّہ تعلیمُ الاسلام لاہور (ضلع صوابی) کے بانی و مہتمم ہیں۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے دورہ حدیث کئے ہوئے ہیں۔ انتھک محنت کر کے مدرسّہ کی عمارت تعمیر کی ہے اور مدرسّہ چلایا ہے۔ تین کتابوں (سلاح المؤمن، نمازِ فجر کی اہمیّت اور ہماری کوتاہی، ھدیۃُ التھیّہ) کے مصنّف ہیں۔ ہمارے سلسلہ سے منسلک ہیں اور تصوّف کے چاروں سلاسل میں صاحبِ خلافت ہیں۔

۲) پروفیسر مُسرّت حسین شاہ صاحب: اسلامیہ کالج پشاور میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے انگلش کیا ہے۔ لِنکن اِن (lincon-inn) برطانیہ میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے طالب علم رہے ہیں۔ جسے ڈیڑھ سال بعد مُناسبتِ طبع نہ ہونے کی بِنا پر چھوڑ دیا۔ اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل رہے ہیں۔ حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانیؒ کے خلیفہ ہیں۔

۳) بشیر احمد طارق صاحب: ممتاز ماہرِ تعلیم ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے ادارۂ تعلیم و تحقیق کے ٹیچنگ سٹاف میں رہے ہیں اور وہیں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ آج کل اپنا سکول (اشرف ماڈل سکول ناصر باغ روڈ پشاور) چلا رہے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف صاحب سلیمانیؒ کے ساتھ ۱۹۴۹ء سے تعلق رہا ہے۔

۴) قاضی فضلِ واحد صاحب: عربی، اسلامیات میں ایم۔اے ہیں۔ وفاق المدارس سے فارغ التحصیل ہیں۔ پاکستان رُورل ڈویلوپمنٹ اکیڈمی پشاور کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ جناب تنظیمُ الحق حلیمی صاحب کے خلیفہ ہیں۔

۴)**مولانا طارق علی شاہ صاحب بُخاری:** کوہاٹ کے بُخاری سادات ہیں۔ کالج میں ایف۔ایس۔سی تک پڑھے ہیں۔اس کے بعد درسِ نظامی میں وفاق المدارس کے سند یافتہ ہیں۔مدرسۃُ الھُدیٰ جو حفظ و دینی تعلیم کے ساتھ،او۔لیول تک انگلش میڈیم سکول ہے کے پرنسپل ہیں۔مُفتی عطاءاللہ صاحب (کراچی) سے بیعت کا تعلّق ہے۔

حضرت امام غزالیؒ

ثاقب علی

ماہنامہ ''غزالی'' کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔جس عظیم، بابرکت اور نابغۂ روزگار شخصیت کے نام پر اس دینی کوشش کا نام رکھا گیا ہے ان کا اسم مبارک حضرت حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد غزالیؒ ہے۔حضرت چھٹی صدی ہجری کے مجدد ہیں، جیسا کی حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ ہر صدی کے سرے پر اللہ تعالیٰ ایسے رجال کو بھیجتا رہے گا جو اس دین کو آلائشوں سے پاک کر کے سنت سے مزیّن کر دیں گے۔

حضرت امام غزالیؒ ۴۵۰ھ میں ایران کے شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ایک غریب گھرانے سے تعلق تھا اس لیے والدہ صاحبہ نے آپ کو ایک مدرسے میں داخل کر دیا کہ علم بھی حاصل کر لیں گے اور کھانے کپڑے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ یہ مدرسہ تاریخ اسلام کا مشہور مدرسہ نظامیہ بغداد تھا۔ یہ مدرسہ سلاطین سلجوق کے نامور وزیر نظام الملک طوسی نے بغداد میں قائم کیا تھا۔حضرت امام غزالیؒ اس مدرسے کے ابتدائی طالبعلموں میں سے تھے۔نظام الملک طوسی سلجوقی بادشاہ ملک شاہ کا وزیرِ باتدبیر اور ایک صالح شخصیت تھا۔حسن بن صباح کی حشیشین تحریک کے فدائیوں نے اس کو شہید کیا۔

جب مدرسہ شروع ہو گیا تو وزیر مدرسے کا دورہ کرنے آیا،اور طلباء سے مل مل کر یہ سوال کرنے لگا کہ مدرسے میں داخل ہونے سے ان کا کیا مقصد ہے؟ مختلف

طلباء نے مختلف جوابات دیے۔ کسی نے قاضی بننے کی خواہش کا اظہار کیا، کسی نے دربار میں بلند مرتبہ پانے کی تمنّا ظاہر کی ۔اسی طرح مختلف مناصب کے حصول کی خواہشات وزیر کے سامنے آتی گئیں ۔ یہ سب سن کر وزیر دلبرداشتہ ہوگیا کہ دین کا علم دنیا کے مناصب کی خاطر حاصل کیا جائے گا! اور اس کی بنیاد اس کا یہ مدرسہ بنے گا۔ نظام الملک نے فیصلہ کرلیا کہ مدرسے کو بند کردیا جائے۔ آخر اس کو ایک گوشے میں ایک طالبعلم مطالعہ میں مشغول نظر آیا۔ وزیر اس کے پاس گیا اور معلوم کیا کہ مدرسے میں داخل ہونے سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس طالبعلم نے جواب دیا کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا اور انسانوں کا کوئی خالق ہے، اور اس کے اپنے بندوں پر بیشمار احسانات ہیں۔ محسن کا شکرادا کرنا انسان کی سرشت ہے، اس لیے لازم ہے کہ خالقِ کائنات کا شکرادا کیا جائے اور اس کو راضی کیا جائے۔ میں یہاں پر وہ علوم حاصل کروں گا جس سے رضائے رب کے طریقے معلوم ہوں گے، اور پھر ان پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مدرسے میں داخل ہونے کا یہ مقصد سن کر وزیر کھل اٹھا، اس نے کہا کہ اس ایک طالبعلم کی خاطر مدرسے کو چلنے دیا جائے۔ یہ طالبعلم محمد غزالی تھے جو بعد میں حضرت حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد غزالیؒ کہلائے۔ جس طرح حضرت کی برکت سے مدرسہ نظامیہ چلا اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے نام کی برکت سے ہمارے رسالے کو بھی شرف قبولیت عطا فرمائے اور اشاعت دین کا ذریعہ بنائے۔

حضرت امام غزالیؒ اپنے دور کے قابل ترین لوگوں میں سے تھے۔ آپ

نے مختلف مروج علوم میں مہارت تامہ حاصل کی اور کم عمری میں ہی بڑوں بڑوں سے آگے نکل گئے۔آپؒ کے اس علمی تبحر کی وجہ سے آپ کو صرف ۳۴ برس کی عمر میں مدرسہ نظامیہ کا سربراہ بنا دیا گیا۔مدرسہ نظامیہ کی نظامت اس دور میں عالم اسلام کا سب سے معتبر علمی منصب سمجھا جاتا تھا۔بڑے بڑے جبالِ علم اس منصب کی آرزو لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن حضرت کو اللہ تعالیٰ نے کم عمری میں بن مانگے یہ مرتبہ عطا کیا۔

آپ کو بادشاہ کے ہاں بھی انتہائی بلند مقام حاصل تھا۔بادشاہ آپؒ کی بہت قدر کرتا تھا۔ایک دفعہ ایک مشکل تنازعے کے حل کے لیے بادشاہ نے آپ کو بھیجا۔

آپؒ کی صلاحیتوں کا ایک زمانے نے اعتراف کیا،لیکن آپ اندر ہی اندر بے چین رہتے تھے۔اطمینان قلب اور حق کی طلب آپ کو تڑپاتی تھی۔آپ سوچتے تھے کہ وہ کونسا بہترین طریقہ ہے جس سے انسان اپنا مقصد پیدائش پالے اور اللہ تعالیٰ کی رضا وقرب حاصل کر لے۔آپؒ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔فقہ میں کمال حاصل کیا اور باریک سے باریک مسائل اور ان کے دلائل یاد کر لیے۔اس دور میں علمِ مناظرہ کا بہت رواج تھا۔امراء اور بادشاہوں کی مجالس میں مناظرے ہوتے رہتے تھے۔آپؒ نے اس میدان مین قدم رکھا اور تمام مناظرین پر غالب آ گئے،لیکن دل مطمئن نہیں ہوا۔یونانی فلسفہ میں مہارت حاصل کی لیکن پھر بھی بات نہ بنی۔اب سب سے آخر میں صوفیاء کا طریقہ رہ گیا تھا۔اس طریقہ میں یہ شرط تھی

کہ دنیا کے تعلقات کو مکمل منقطع کر دیا جائے اور ایک عرصے تک یکسوئی سے کسی شیخ ِطریقت کی نگرانی میں ذکر و عبادات کی جائیں۔ دوسرے طریقوں میں تو پہلے علم حاصل کرنا تھا اور پھر عمل کرنا تھا جبکہ اس طریقہ میں پہلے عملی مجاہدات تھے اور پھر ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے باطن علم معرفت سے منوّر ہوتا تھا۔ یعنی

بینی اندر خود علوم انبیا　　بے کتاب و بے معید واوستا

(ترجمہ: اپنے اندر بغیر کتاب، بغیر مددگار اور بغیر استاد کے علوم انبیا کو دیکھتے ہیں)

والی کیفیت حاصل کرنا تھی۔

چونکہ حضرت کی طبیعت میں قدرت نے حق کی تڑپ رکھ دی تھی اس لیے آپ تمام مسانید و اعزازات اور گھر بار کو چھوڑ کر گوشۂ تنہائی میں جانا چاہتے تھے۔ آپ کے ساتھی علماء اور آپ کے خاندان والے آپ کو اس کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس اندرونی کشمکش نے آپ کو بیمار کر دیا، یہاں تک کہ طبیبوں نے آپ کے مرض کو لاعلاج قرار دے دیا۔

آپ کے ایک بھائی احمد غزالی صوفی تھے۔ ایک روز حضرت غزالیؒ مدرسہ نظامیہ میں وعظ کہہ رہے تھے کہ آپ کے بھائی آ گئے۔ انھوں نے ایک خاص کیفیت سے کہا کہ کب تک دوسروں کے لیے سان بنے رہو گے اور اپنی فکر نہیں کرو گے! یہ سننا تھا کہ آپ کا دل تمام باتوں سے سرد ہو گیا، اہل خاندان نے بھی آپ کو اجازت دے دی اور آپ یکسوئی سے جنگل میں عبادت و ذکر کے لیے تشریف لے گئے۔

سب سے پہلے آپ حضرت ابراھیم علیہ السلام کے مزار مبارک پر حاضر

ہوئے اور تین عہد کیے، ا۔کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں جائیں گے ۲۔کسی بادشاہ کا عطیہ قبول نہیں کریں گے ۳۔کسی سے بحث ومناظرہ نہیں کریں گے۔

حضرت امام غزالیؒ کے شیخ کے بارے میں یقینی طور پر تو معلوم نہیں لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ اپنے دور کے مشہور صوفی بوعلی فارمدیؒ سے بیعت ہوئے۔غرض کہ آپ دس سال تک حالت سفر میں رہے اور مکمل یکسوئی سے ذکرو عبادت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے معرفت کے تمام دروازے آپ پر کھول دیے۔صوفیاء کے طریقے کے مکاشفات اور معارف آپ کو حاصل ہو گئے، اور حق کو پا کر آپؒ کے دل کو قرار آ گیا۔

اس دس برس کے دور میں آپؒ کے قلم سے وہ معرکۃ الآراء کتاب نکلی جس نے تصوف کے علوم کو دنیا کے سامنے سورج کی طرح روشن کر کے رکھ دیا۔اس مبارک کتاب کو وہ قبولیت عطا ہوئی جو شاید ہی کسی دوسری کتاب کو عطا ہوئی ہو۔کہتے ہیں کہ قرآن شریف اور بخاری شریف کے بعد اسلام کی نمائندہ کتاب احیاء العلوم ہے۔ایک بزرگ احیاء العلوم کی مخالفت میں بولتے تھے۔ایک صبح وہ اس کو ہاتھ میں لیے ہوئے باہر آئے اور لوگوں سے کہا کہ جانتے ہو کہ یہ کیسی کتاب ہے۔پھر خود ہی فرمایا کہ اس کتاب کی مخالفت کرنے کی بدولت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مجھے کوڑے مارے ہیں، پھر انھوں نے اپنی ٹانگوں پر کوڑوں کے نشانات دکھائے۔

آج سے تقریباً دو سال پہلے فجر کی تعلیم میں بندہ کے شیخ ڈاکٹر فدا محمد صاحب نے احیاء العلوم کا درس شروع کروایا۔ بندہ نے جب ابتدائی چند سطریں

پڑھیں تو ایک فقیر انوارات کے احساس پر عش عش کر اٹھے اور فرمایا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا امام غزالیؒ پاس بیٹھے ہیں۔ ان کا درمیانہ قد ہے اور ہلکا بدن ہے۔ پھر بندہ نے عرض کیا کہ فلاں فلاں باب پہلے پڑھیں گے اور دوسرے بعد میں پڑھیں گے تو اُن فقیر نے ہی فرمایا کہ اس کتاب کی ترتیب میں بھی حکمت ہے۔ چنانچہ کتاب ترتیب سے شروع کی گئی اور اب بحمداللہ آخری جلد جاری ہے جس کے رمضان المبارک تک ختم ہونے کا امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول فرمائے اور ہماری ھدایت اور حصول تقویٰ کا ذریعہ بنائے۔

اپنے دور کے انتہائی طاقتور بادشاہ شاہ سنجر نے حضرت امام غزالیؒ سے ملاقات کی خوہش ظاہر کی۔ لیکن آپ نے اسے حضرت ابراھیم علیہ السّلام کے مزار پر کیا گیا عہد بتایا اور ملنے سے معذوری ظاہر کی۔ بادشاہ نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آپ اس کے دربار میں تشریف لے گئے۔ آپؒ کا کلام سن کر بادشاہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ملک کے تمام علماء کے لیے لازم کر دوں کہ سال میں ایک بار آپ کے پاس استفادے کے لیے ضرور حاضر ہوں۔

غرض دس سال کی عزلت کے بعد آپؒ واپس اپنے شہر تشریف لائے۔ اپنے گھر کے پاس ایک مدرسہ اور ایک ملحقہ خانقاہ قائم کی۔ عوام کی درخواست پر آپ نے احیاء العلوم کا خلاصہ کیمیائے سعادت کے نام سے فارسی زبان میں لکھا، جبکہ احیاء العلوم عربی زبان میں تھی۔ آپؒ کی واپس تشریف آوری تقریباً ۵۰۱ھ میں ہوئی جو کہ نئی اسلامی صدی کا آغاز تھا اور حدیث شریف کے مفہوم کے مطابق ایک

نئے مجدد کا ظہور ہونا تھا۔تمام علمائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ اس صدی کے مجدد حضرت امام غزالیؒ تھے۔

ایک بزرگ کا کشف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام اکٹھے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ایک ستارے کی طرف اشارہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کی آپ کی امت میں کوئی ایسا عالم ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے اقرار کیا کہ نہیں ہے۔امت کا یہ ستارہ حضرت امام غزالیؒ تھے۔

۵۰۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔آپ کے بھائی آپ کی وفات کا عجیب واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز نماز اشراق کے بعد آپ نے اپنا کفن منگوایا، اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا، کفن پہن کر لیٹ گئے اور فرمایا کہ آقا کا حکم سر آنکھوں پر، جب پاس جا کر دیکھا تو آپ وفات پا چکے تھے۔

حضرت کی وفات کی خبر عالم اسلام میں بہت غم کے ساتھ سنی گئی۔اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں بیت اللہ شریف کا طواف کبھی نہیں رکا، لیکن حضرت امام غزالیؒ کی وفات پر بیت اللہ شریف کا طواف روک کر آپ کے مسلک کے مطابق آپ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

حضرت امام غزالیؒ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔پانچ بیٹیاں تھیں، لیکن آپؒ کے علم وفضل کے باعث تا قیامت آپ کے چاہنے والے اور تعلیمات سے استفادہ کرنے والے باقی رہیں گے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ انحطاط اور ان کی جدوجہد

(مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ)(۱۹۷۱-۱-۱۹)

مسلمانوں کا ہندوستان میں زوال اورنگذیب عالمگیرؒ کے بعد شروع ہوا۔ اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کی بنیادیں دور اکبر میں ہی پڑ چکی تھیں۔ جب تک مغل بادشاہ قوت میں تھے، باغی اور غیر مسلم قوتیں سر نہ اٹھا سکیں۔ لیکن جب عالمگیرؒ کے بعد مغل خاندان کا ایسا فرمانروا نہ رہا جو اتنی بڑی اور وسیع سلطنت کو سنبھال سکے تو وہ مختلف عوامل جو ابھی تک دبے ہوئے تھے، عالمگیرؒ کی وفات کے آٹھ دس سال بعد ہی سر اٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس سال کے عرصے میں وہ سلطنت جو ایک طرف ترکستان اور کابل اور دوسری طرف جنوبی ہند تک پھیلی ہوئی تھی اور بنگال و برما پر اس کا جھنڈا لہرا رہا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ کہیں روہیلے، کہیں مرہٹے، کہیں راجپوت، کہیں نواب اور راجے مہاراجے اقتدار کی باگیں سنبھال کر سامنے آ گئے۔ یہ تو اندرونی انتشار اور خلفشار تھا۔ بیرونی ممالک میں یورپی اقوام جو اپنی اٹھتی ہوئی قوتوں کی بناء پر مشرقی حکومتوں کے دعویدار تھے، پہلے پہل تاجروں کی حیثیت میں ملک میں داخل ہوئے، اور پھر ملک کے کمزور حالات، خانہ جنگیوں اور انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جگہ جگہ اپنی ہوس اقتدار کو پورا کرنے لگے۔ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی نے مشرقی ہندوستان سے

مسلمانوں کا اقتدار ختم کر کے انگریزوں کی حکومت قائم کر دی۔ بہار اور یو۔ پی تک کے علاقے اُن کے زیر نگیں آ گئے۔ جنوب میں مسلمانوں نے آخری انگڑائی حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید کی سرکردگی میں لی، لیکن غدار میر صادق کی وجہ سے سرنگا پٹم کی جنگ کے بعد مسلمانوں کی آخری امید بھی ختم ہوگئی۔ مسلمانوں کے لیے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ دہلی کے آس پاس ان کی حکومت رہ گئی۔ دہلی، جہاں مسلمانوں کا برائے نام بادشاہ رہتا تھا وہ بھی مرہٹوں کے اقتدار میں آ گیا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا ایک طبقہ سلطنت سے زیادہ مسلمانوں کا وجود بچانے کے درپے اور فکر مند تھا کہ مسلمانوں کا تہذیب و تمدن باقی رہ جائے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انگریز نے سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی اور مسلمان ہی انگریزوں کے اصل حریف اور مد مقابل تھے۔ ہندوستان کی دوسری بڑی قوم (ہندو) جو صدیوں سے غلام رہ چکے تھے، کو انگریز نے اپنا ہمنوا اور ساتھی بنانے کی کوشش کی۔ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو آگے لایا۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں جو شخصیت سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ذات گرامی ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۱۱۱ھ میں ہوئی۔ شاہ ولی اللہ کے والد ماجد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی اس مجلس کے شرکاء میں سے تھے، جس نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کا عروج و کمال بھی دیکھا تھا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ہی حالات نے ایسا پلٹا کھایا جیسا کہ آپؒ کے مکتوبات اور تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر

وہ خون کے آنسو روئے ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ نے مختلف لوگوں کے نام جو مکتوبات و پیغام بھیجے ہیں ان میں ان کی دوراندیشی، بصیرت اور سیاسی حقائق پر ان کی نظر کی وسعت اور گہرائی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔آپ نے اپنی بعض کتابوں میں مختلف طبقات امت سے خطاب کرتے ہوئے ان امراض کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں میں زوال آیا۔ان کی مختلف کتابیں خصوصاً حجۃ البالغہ اور الفوز الکبیر وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کا حکم رکھتی ہیں۔شاہ صاحب نے صرف اس پر اکتفانہیں کیا کہ علمی محاذ پر مسلمانوں کے گرتے ہوئے معاشرے کو سنبھالیں، بلکہ انھوں نے ایک طرف اپنے بیٹوں اور شاگردوں کے ذریعے ایسے دینی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے آثار آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔شاہ عبدالعزیز،شاہ عبدالقادر،شاہ عبدالغنی اورشاہ رفیع الدّین جوحضرت شاہ ولی اللہ کے بیٹے ہیں،اورشاہ صاحب کے بیٹوں کے شاگرداورانکے شاگردوں کے شاگردوں نے جس دینی ادب کو وجود بخشا وہ کئی کتب خانوں پر حاوی ہے۔دوسری طرف مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کے وجود اور تہذیب وتمدن کو مرہٹوں کے استیلاء سے بچانے کے لیے انھوں نے احمد شاہ ابدالی کو ۱۷۶۱ء میں ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی قوت کو پارہ پارہ کردیا۔حضرت شاہ صاحب کے بعدان کی مسندِ علم و درس کوان کے بیٹوں نے سنبھالا اور مختلف تصانیف کے ذریعے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تربیت سے سید احمد شہید اور حضرت شاہ

اسماعیل شہیدؒ جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں، جن کے اثرات برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر انمٹ ہیں۔ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک صرف ایک جنگی تحریک نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ جہاد اور دین کے احیاء کے لیے نظم و نثر میں ایسا لٹریچر تیار کیا جارہا تھا جو کہ مسلمانوں میں ردِ بدعت اور اعتصامِ سنت کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے ہر مسلمان کے اندر جہاد کا ولولہ پیدا کرے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تقویت الایمان نے اس سلسلہ میں عامۃ الناس میں کافی کام کیا اور علماء کے طبقے میں ''صراطِ مستقیم'' اور ''عبقات'' وغیرہ نے اپنے اثرات چھوڑے۔ اس زمانہ میں مسلمان شعراء نے ایسے ترانے اور نظمیں لکھیں جو آسان زبان میں تھیں اور گھر گھر پڑھی جاتی تھیں۔ مؤمن خان مؤمن کا ترانۂ جہاد بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ اس لٹریچر نے مسلمانوں کے اندر جہاد کا وہ ولولہ پیدا کیا کہ اس کا نتیجہ تھا کہ سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد بھی ولیم ہنٹر اپنی کتاب "The Indian Muslims" میں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ جب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ موجود ہے یہاں پر انگریز کی حکومت ناممکن ہے۔

لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے اجراء کے پس منظر میں اس جہاد کے جذبے کا توڑ تھا۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ شکل وصورت تو کالی رہے اور لیکن خیالات و جذبات انگریزی ہو۔ بقول مسیو لینان جیسا کہ اس نے تمدن ہند میں لکھا ہے کہ ایسی قوم پیدا ہو جو صورت و شکل میں تو کالی ہو لیکن اپنے دماغ و ذہن و سوچ میں انگریز ہو۔ وہی آگے جا کر لکھتا ہے کہ میکالے اپنے مشن میں

کامیاب رہا اور ہندوستان میں ایسی قوم پیدا ہوگئی جو کہ ''بابو'' کے نام سے مشہور ہے اور وہ انگریز حکومت کے کارندے کے طور پر سب سے مفید آرگن (organ) ہے۔

سید احمد شہید اور ان کے متعلقین نے جو جہاد کا صور پھونکا تھا وہ ۱۸۳۱ء کے بالاکوٹ کے معرکے پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ مجاہدین نے مختلف جگہوں پر اپنے مراکز قائم کیے جن میں چمرکند اور ٹونک کے مراکز خاص طور پر مشہور ہیں۔سید صاحب کے لوگ سید صاحب کی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے مختلف کتابوں اور رسالوں کی صورت میں ان کی تعلیمات کو عام کرتے رہے۔

انگریز جس وقت ہندوستان آئے انھوں نے سر ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد رکھ کر وہاں اس لٹریچر کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی جو کہ مذہبی رخ سے زیادہ افسانوں پر مبنی تھا۔ چنانچہ قصۂ چہار درویش، گل بکاؤلی اور طوطا مینا قسم کے افسانوں کی بنیاد رکھی۔

دینی لٹریچر کے اثرات:

شاہ ولی اللہ کی تحریک اور سید احمد شہید کی تحریک گو ظاہراً بالاکوٹ میں ختم ہو گئی، لیکن درحقیقت وہ اپنے دوررس اثرات کی بناء پر ختم نہیں ہوئی۔اگر ہم یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بالاکوٹ کا معرکہ ۱۸۳۱ء میں واقع ہوتا ہے۔اس دور میں ایسے عوامل

پیدا ہو جاتے ہیں جس سے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی شروع ہو جاتی ہے۔ جنگ آزادی میں سب سے زیادہ حصہ جس طبقہ نے لیا وہ علماء کا طبقہ تھا، جس میں سے اکثریت یا تو بعد میں شہید کر دی گئی یا جلاوطن کر دی گئی یا ہجرت کرنے پر مجبور کر دی گئی۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی ایک آئندہ بننے والی تحریک (دیوبند تحریک) کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ اس جنگ میں بنفس نفیس معرکۂ شاملی میں شریک ہوئے، ان کے علاوہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد ضامن شہیدؒ وغیرہ اکابر اولیاء وعلماء شریک تھے۔ یہ علماء جس طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی اور مسلمانوں کے احیاء کی تحریک پر اثر انداز ہوئے وہ تاریخ کا ایک ناقابل انکار واقعہ ہے۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ ہندوستان اور پاکستان میں انیسوی صدی کے آخر اور بیسوی صدی کے شروع میں سلاسل تصوف پر جس طرح اثر انداز ہوئے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کی علمی اور عملی توسیع اور تبلیغ میں ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء نے ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیے۔ ان کا تصوف ترک سعی اور رہبانیت کا حامل نہیں تھا بلکہ اپنے پیروکاروں میں مجاہدانہ اسپرٹ اور ولولہ پیدا کرنے والا تھا۔ اس وجہ سے اس سلسلہ کے بڑے بڑے منسلک حضرات ہند و پاک کی جنگ آزادی میں صف اوّل کے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مدرسہ دیوبند نے جو لٹریچر اس سلسلہ میں مہیا کیا وہ دینی علوم کے علاوہ جہاد آزادی کے لیے بھی اپنے دوررس نتائج کی بناء پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے خلفاء اور مدرسہ دیو بند کے فضلاء کے ہاتھوں جس کثرت سے تصنیفی کام ہوا اس کی مثال دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ دیو بند ایک دینی مدرسہ اس معنی میں نہیں تھا کہ لوگوں کو دینی فرائض واعمال سے آگاہ کرے بلکہ وہ مستقل ایک ایسی علمی تحریک تھی جس پر جہاد کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس موقع پر ہم شیخ الہندؒ کا قول نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، فرمایا کہ ''ہمارے بزرگوں نے اس مدرسہ کو صرف دینی تعلیم کے لیے ہی نہیں بنایا تھا بلکہ اپنی جہاد کی سرگرمیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے ایک مدرسہ کی صورت وحیثیت دی تھی۔ مدرسہ دیو بند کی تاسیس کے تھوڑے عرصے بعد سہارن پور کا مدرسہ قائم کیا گیا، گویا وہ بھی اس تحریک کا دوسرا جزو تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کے ایک طبقہ پر ناامیدی طاری کی اور اپنے دین کے بارے میں مایوسی کی کیفیت پیدا کردی۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ شاید دین کے ساتھ ہم کماحقہٗ کامیاب نہیں ہوسکتے، بلکہ کامیابی کا ذریعہ موجودہ دور کے وہ علوم ہیں جنھیں انگریز لے کر آیا ہے۔ اس طبقہ کا یہ بھی خیال تھا کہ انگریز اب یہاں آچکا ہے اور مضبوط ہو گیا ہے اور وہ ہندوؤں کو آگے بڑھانا چاہتا ہے، اس لیے موجودہ تعلیم کو اس رخ سے اختیار کیا جائے کہ انگریز جو مسلمانوں کو اصلاً جنگ آزادی کا بانی مبانی سمجھتا ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں سے نفرت اور دشمنی کر رہا ہے اس تعلیم سے انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کی نفرت ختم ہو جائے۔ اس طبقہ کا سب سے بڑا سرخیل اور ترجمان سر سید احمد خان مرحوم تھے۔ وہ انگلستان

گئے اور آنے کے بعد اس مکتب فکر کی بنیاد ڈالی کہ مسلمانوں میں حکومت کے چلے جانے کے بعد انحطاط اور مروجہ علوم سے جو بیزاری پیدا ہوگئی ہے اسے دور کیا جائے اور انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی قدر پیدا کی جائے۔اس کے لیے انھوں نے علی گڑھ کالج کو وجود بخشا۔سرسید کی تحریک نے آگے جاکر جو بھی رخ اختیار کیا لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سرسید مرحوم اس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کی نگاہوں میں اونچا کرنے کے لیے انگریزی علوم کی ترویج کی کوشش کر رہے تھے۔جیسا کہ حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں ایک مقام پر سرسید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری زندگی کا یہ مقصد ہے کہ میں ملکہ معظّمہ کی حکومت کو ہندوستان میں eternal (لافانی) کردوں۔سرسید اور ان کے رفقاء حالی، محسن الملک، وقارالملک، ڈپٹی نذیر احمد اور اس قسم کے لوگ تقریباً تیس سال تک اس فکر کے تحت کہ انگریزوں کے ذہنوں سے مسلمانوں کے متعلق بدگمانی ختم ہوجائے اور مسلمان انگریزوں کے قریب ہوجائیں، حکومت برطانیہ کی برکات کی اشاعت کرتے رہے۔سرسید کی تہذیب الاخلاق اور دیگر تحریریں، حالی کے اشعار اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب ابن الوقت وغیرہ میں یہ چیزیں مل جائیں گی۔سرسید صاحب کی تحریک کے نتیجہ کے طور پر جو لٹریچر پیدا ہوا اس نے مسلمانوں میں دنیاوی لحاظ سے ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کا اور اپنی انفرادیت کا ایک جذبہ پیدا کیا، لیکن وہ جذبہ انگریزوں کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ تھا۔سرسید کے ۱۸۹۸ء میں انتقال کے بعد علی گڑھ تحریک کچھ عرصہ تک اسی ڈگر پر چلتی رہی۔

۱۸۸۵ء میں انگریزوں کی ایماء پر ایک سیاسی جماعت وجود میں آئی جسکا نام انڈین نیشنل کانگرس تھا۔ یہ کانگرس گو کہ دعویٰ تمام ہندوستانی قوموں کی نمائندگی کا کرتی تھی لیکن اس پر ہندوؤں کا عنصر غالب تھا اور مسلمانوں کو اس سے دنیاوی فائدے کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔اس چیز کو سرسید نے اپنی زندگی میں بھانپ لیا تھا اور اس نے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے سے روکا۔نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خان کی سرکردگی میں جس میں محسن الملک وغیرہ بھی شامل تھے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' رکھا گیا۔ یہ جماعت شروع میں کانگرس ہی کی طرح چند قراردادیں پاس کرنے پر اکتفا کرتی رہی اور اپنے مطالبات معذرت خواہانہ و عاجزانہ طور پر حکومت کے سامنے پیش کرتی رہی۔بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے جلسے اکٹھے ہو جاتے۔آئندہ کے بعض واقعات نے مسلم لیگ کو اپنے پرانے رخ سے نئے رخ پر ڈال دیا، جس میں مشہور واقعات تقسیمِ بنگال کی تنسیخ، مسجد کانپور کی شہادت اور جنگِ طرابلس تھی۔

جیسے ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں کہ انگریز کی نظر میں مسلمان باغی اور سرکش جمیعت تھے اور ان کی سرکشی اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی تھی جب تک ان میں سے دین اور جذبۂ جہاد کو ختم نہ کیا جائے۔اس کے لیے انگریزوں کو ایسے ہندوستانی شخص کی ضرورت تھی جو مسلمانوں سے یہ جذبہ مذہب کے نام پر نکالے۔ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ میں مایوسی پیدا ہو چکی تھی اور اس مایوسی کے نتیجہ کے طور پر بعض لوگ ان پیروں اور نام نہاد درویشوں کے پیچھے پھر

رہے تھے جو اسلام کو توصحیح رخ پر پیش نہ کر سکتے ہوں لیکن تصوف کے دعویدار ہوں۔ برطانیہ کو اپنی اس تلاش میں جو سب سے معاون شخصیت ملی وہ پنجاب کے ضلع گورداسپور کے موضع قادیان کا غلام احمد تھا۔اس کی تحریک کی بنیاد انگریز نے خود قائم کی جیسے کہ غلام احمد قادیانی کا اپنا ارشاد ہے کہ ''میں حکومت انگلیشیہ کا خود کاشتہ پودا ہوں۔'' حکومت برطانیہ نے اپنے اس ہونہار پودے کی اپنے خاص سایہ میں پرورش کی۔اور حکومت انگلیشیہ کا یہ فرزند دلپذیر بقول ملکۂ برطانیہ وکٹوریہ اس مقصد کو کماحقہٗ پورا کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ پوری ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے پبلک کو فوری طور پر چوکنا کرنے کی بجائے آہستہ آہستہ مختلف مراتب سے گذر کر مرزا قادیانی مجدد سے پیغمبر بن بیٹھا۔اس کے باطل اور دجل شریعت کے دو بنیادی اصول یہ قرار پائے کہ وہ حکومت برطانیہ کا ہمیشہ وفادار رہے گا اور جو اس پر ایمان لائے گا وہ جہاد کا انکار کرے گا۔

پیر او لارد فرنگی را مرید
گرچه می گوید از مقام بایزید

ترجمہ:اس کا پیر لارڈ فرنگی کا مرید ہے۔اگرچہ باتیں حضرت بایزید بسطامی جیسی کرتا ہے۔

''وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت وشوکت کا پیام!'' (اقبال)

ان کی جماعت ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر سے افراد کو توڑ توڑ کر اپنا

علیحدہ معاشرہ بناتی رہی اور دوسری طرف حکومتِ برطانیہ کے اشاروں پر مسلمانوں کے عام مفادات کے خلاف کام کرتی رہی۔

ندوۃ العماء:

جس طرح دیوبند ایک دینی مدرسہ تھا اور علی گڑھ دنیاوی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کے لیے قائم تھا، ندوہ کے بانیوں نے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ سے بھی واقف رکھا جائے تاکہ وہ موجودہ دور کے فتنوں کا جواب بھی دے سکیں۔ ندوہ گو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہو چکا تھا لیکن اس کا عروج علامہ شبلی نعمانی کی آمد سے شروع ہوا۔ ندوہ کی تحریک دیوبند اور علی گڑھ دونوں تحریکوں کا سنگم ہے۔ ندوہ نے جو لٹریچر پیدا کیا اس نے علی گڑھ والوں کا انگریزوں کی طرف کلی جھکاؤ کم کرنے میں بڑا کام کیا۔ ''الندوہ'' کا رسالہ جو پہلے شبلی نعمانیؒ اور پھر سید سلیمانؒ کے زیر ارادت ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۱ء تک نکلتا رہا کے مضامین نے مسلمانوں میں ایک علمی ذوق کے ساتھ سیاسی بیداری پیدا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کا محور اسلامی مملک کے ساتھ تعلقات اور خلافت ہوا کرتی تھی۔ شبلی کے مضامین نے انگریزوں کے جال کو توڑنے میں بڑا کام کیا۔ اس کے بعد جنگ بلقان، جنگ طرابلس اور کانپور کے واقعات نے مسلمانوں میں ایک عمومی بیداری پیدا کر دی۔ اس بیداری کے پیدا کرنے میں جن حضرات کی نظم و نثر نے خاص طور پر کام کیا اس میں ہم شبلی کے مضامین، ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' کے مضامین، محمد علی جوہر کے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' کے مضامین

اور اقبال اور حسرت موہانی کی شاعری نے قابل ذکر ہیں۔ البلاغ اور الہلال کے مضامین نے پورے ہندوستان کو ہلا دیا۔ محمد علی جوہر کے کامریڈ کی تحریروں سے قصرِ حکومت میں بھونچال آ گیا۔ الہلال کی انگریزی پر دسترس اور بے باکی نے مسلمان نوجوانوں کے دلوں سے انگریزوں کی مرعوبیت کے نشانات مٹا دیے۔ کامریڈ جس وقت چھپتا تھا، اس وقت کا گورنر جنرل جب تک اس کو پڑھ نہیں لیتا تھا آرام نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں کو اپنا ماضی یاد دلانے اور بیداری پیدا کرنے میں مسدس حالی نے بھی بڑا کام کیا۔ سرسید کہا کرتے تھے کہ اگر قیامت میں اللہ تعالیٰ پوچھے کہ کیا لیکر آئے ہو تو میں کہونگا کہ مسدس حالی لیکر آیا ہوں۔ اقبال نے سرسید سے کے متعلق لکھا ہے۔

رہبر کے ایماء سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے

زمیندار اخبار کے مضامین اور ظفر علی خان کی نظموں نے بھی بہت کام کیا ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب انگریزوں کی خلافت عثمانیہ کے ساتھ جنگ چھڑ گئی تو یہاں کے مسلمانوں نے اسے اسلام پر حملہ تصور کیا۔ مسلمانوں کے مختلف طبقات نے مختلف صورتوں سے انگریز کے خلاف کام شروع کیا۔ جن میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی ریشمی رومال تحریک، ابوالکلام آزاد کے الہلال اور محمد علی جوہر کے ہمدرد کی تحریریں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کی جگہ سید سلیمان ندویؒ نے سنبھالی۔ اس سلسلہ میں انگریز تہذیب پر طنزیہ رخ سے جس شخص نے سب سے زیادہ چوٹیں کیں وہ اردو کے حکیم

وظریف شاعر اکبر الہ آبادی ہیں۔ جن کا کلام ظرفت کے پیرایہ میں موجودہ تہذیب پر سب سے بڑا حملہ تھا۔

اس کے بعد تحریکِ خلافت شروع ہوتی ہے جس نے ادب کے ایک نئے ذخیرہ کو جنم دیا، جس میں سید سلیمان ندویؒ کے مضامین، البلاغ کی تحریریں، معارف کے علمی مضامین، زمیندار اخبار کے آتشیں مضامین اور ''ہمدرد'' دہلی کی تحریروں نے بہت کام کیا۔ حسرت موہانی کا رسالہ ''المعلیٰ''، نوائے وقت ۱۹۴۴ء، ''انقلاب'' غلام رسول مہر کا، ان اخباروں نے بھی تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آزادی سے کیا مراد ہے:

علمائے سیاست کی نگاہ میں آزادی سے مراد انسان کا اجتماعی زندگی اس طور پر گذارنا کہ وہ اپنے نظریاتِ حیات، رہن سہن کے طریقے اور انفرادی واجتماعی احوال میں کسی غیر قوم یا طاقت کا پابند نہ ہو۔ بلکہ اپنے ضمیر کی آزادی کے ساتھ اپنے مسائل کا حل خود پیش کرتے ہوئے زندگی گذار سکے۔ اسلام کے نزدیک آزادی چند پابندیوں کو چاہتی ہے۔ اسلام میں سروری مخلوق کا حق نہیں ہے بلکہ سروری صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے۔ بقول اقبال؎

سروری زیبا فقط اک ذات بے ہمتا کو ہے

اب اللہ تعالیٰ کے اس اختیار کو اس کے بندے نائب، خلیفہ یا وائسرائے کی حیثیت سے ان حدود کے اندر استعمال کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ ان کو اسلام کی اصطلاح میں حدودِ الٰہی یا احکام الٰہی کہتے ہیں۔ گویا اسلام حدود

الٰہی کی پابندی کو آزادی قرار دیتا ہے۔ دنیا کے سیکولر نظام بھی آزاد شہریوں پر کچھ حقوق و فرائض لازم کرتے ہیں۔ لیکن یہ حقوق و فرائض انسانوں کے خود ساختہ ہوتے ہیں اور انسانی ساختہ قوانین کبھی بھی تمام طبقات کے لیے عادلانہ حدود مقرر نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر طبقہ اپنے اپنے طبعی میلانات کی وجہ سے اپنے طبقہ کی حمایت کرے گا اور ان کے مفادات کا خیال رکھے گا۔ اس لیے عادلانہ قانون اور حدود صرف اور صرف وہی ہو سکتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہیں۔ اس لیے اصل آزادی بندوں کے لیے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کی جائے جن کو دوسرے الفاظ میں شریعت کہتے ہیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حقیقت میں آزاد ہونا اللہ تعالیٰ کے احکامات کے پابند ہونے کا نام ہے۔
جب تک یہ آزادی نہیں ہو گی چاہتوں کے پھندے میں پھنسے رہیں گے۔
بقول سید سلیمان ندویؒ

تھی جب آزادی تو ہر سو دوڑ تھی
اب قید میں آرام ہی آرام ہے

☆☆☆☆☆☆☆

مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ

بزمِ اشرف سلیمانیؒ

حضرت مولانا محمد اشرف خان سلیمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ”گذشتہ سال (۱۹۸۴ء) پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت نے رجم کو شرعی حد ماننے سے انکار کر دیا ،جس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا اور علماء کے زور پر حکومت نے انھیں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کے لیے کہا۔انھوں نے مختلف لوگوں سے دلائل مانگے۔فقیر سے بھی کہا گیا۔بندہ اس وقت شدید بیماری کی حالت میں ہسپتال میں تھا،لیکن قدرتاً شدید داعیہ پیدا ہوا۔ڈاکٹروں کے علی الرغم ہسپتال میں کتابیں منگائیں، دیکھتا تھا اور املاء کراتا تھا۔آخر ایک بڑا بیان تیار ہو گیا۔بندہ ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود بمشکل عدالت میں پہنچا اور بیان دیا۔عدالت بحمد اللہ متاثر ہوئی۔صرف دو اشکال رہ گئے ،ایک یہ کہ ”سنینِ رجم“ کون سے ہیں (یعنی کس سن ہجری میں رجم ہوا) اور دوسرا کیا ”حد“ تعزیر میں بدل سکتی ہے؟ بندہ نے اپنے جواب لکھ کر بھیجے اور بحمد اللہ عدالت نے اپنے غلط فیصلہ سے رجوع کر کے پھر سے ”رجم“ کو شرعی ”حد“ قرار دے دیا۔اس بارے میں ”سنین رجم“ کے سلسلے میں مواد نہیں مل رہا تھا۔خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی کہ میرے دائیں طرف تشریف فرما ہیں اور سامنے حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ (حضرت مولانا زکریاؒ) بندہ کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے مولوی صاحب کا منہ میری طرف ہے۔حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان سے پوچھ! دوسرے مولوی صاحب کہتے ہیں مجھ

سے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تجھ سے کون کہتا ہے؟ ان سے! اور حضرت شیخ الحدیث کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ بندہ نے بیداری کے بعد سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد حضرت شیخؒ کی کتابوں سے استفادہ کا ہے۔ اوجز کی کتاب ''الحدود'' نکالی اور فوراً ہی سنین کا مسئلہ حل ہوگیا۔

حل ایں نکتہ از روئے نگار آخر شد

(ترجمہ: یہ نکتہ محبوب کے چہرے سے حل ہوا۔ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے حل ہوا)

حضرت قدس سرہٗ کو یہ خواب لکھ کر جناب صوفی اقبالؒ کے ہاتھوں بھیجا گیا۔ حضرت شیخؒ نے مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنی یادداشت میں نقل کرلیا۔

☆☆☆☆☆

ثاقب علی خان

وضو کی احتیاط

وضو میں جن اعضاء کا دھونا فرض ہے ان میں دھونے کی حد یہ ہے،

''اتنا پانی ڈالنا کہ عضو پر بہہ کر ایک دو قطرے ٹپک جائیں، دھونے کی ادنیٰ مقدار ہے، اس سے کم کو دھونا نہیں کہتے۔ مثلاً کسی نے ہاتھ بھگو کر منہ پر پھیر لیا، یا اس قدر تھوڑا پانی ڈالا کہ وہ بہہ کر منہ پر ہی رہ گیا ٹپکا نہیں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ منہ دھویا اور وضو صحیح نہ ہوگا۔''

''تعلیم الاسلام''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض لوگ وضو میں منہ دھوتے وقت ناک پر پانی ڈالتے ہیں جس سے پیشانی وغیرہ پر پانی نہیں بہتا بلکہ صرف گیلا ہاتھ پھر جاتا ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ منہ دھونے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر پیشانی پر ڈالیں تاکہ پورے چہرے پر پانی بہہ جائے اور فرض ادا ہو جائے۔

اسی طرح ہاتھ کہنیوں تک دھونے کا بھی صحیح طریقہ یہ ہے کہ چلو میں پانی لیا جائے اور اس کو کہنی کی طرف بہایا جائے۔ نلکے کے نیچے کہنی رکھ کر ہاتھ کی طرف پانی بہانا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

جو جو عضو آدمی دھوتا جائے اس میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ ہاتھ بھی پھیرتا جائے تاکہ پورے عضو پر پانی خوب اچھی طرح پھیل جائے

☆☆☆☆☆